© rasailojaraid.com

جناب پروفیسر محمد سلیمان اظہر ایم۔ اے

قسط نمبر ۲ (آخری)

حدیثِ نجد

ارشد قادری صاحب کی پیش کردہ روایات پر ایک نظر:

جناب ارشد القادری صاحب نے وہابیوں کو مبغوض اور نجدِ یمامہ کو دارالفتن ثابت کرنے کیلئے اس باب میں ۱۵ احادیث نقل کی ہیں۔ آئیے اب ان کا بھی جائزہ لے لیں:

پہلی حدیث بخاری سے نقل کی گئی ہے، اس میں نجد کا لفظ بھی موجود ہے۔ لیکن ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ نجد ایک نہیں، بارہ ہیں۔ اس لئے اس نجد سے نجد الیمامہ ہی مراد لینا غلط ہے۔ دوسری حدیث مسلم شریف سے نقل کی گئی ہے جس میں نجد کی بجائے مشرق کا ذکر ہے۔ تیسری حدیث بھی مسلم شریف سے ہے اور اس میں بھی نجد کی بجائے مشرق کا ذکر ہے۔ اور چوتھی کا بھی یہی حال ہے۔ گویا ان چاروں احادیث کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مشرق میں جو نجد کا علاقہ ہے وہ دارالفتن ہے۔ اور چونکہ ہم بتا چکے ہیں، مدینہ سے مشرق کی جانب نجدِ یمامہ نہیں بلکہ نجدِ عراق ہے۔ اس لئے قادری صاحب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ دارالفتن نجدِ عراق بن جاتا ہے۔

پانچویں چھٹی اور ساتویں حدیث قادری صاحب نے دحلان کی کتاب الدرالسنیہ سے نقل کی ہے اور بتایا ہے کہ دحلان نے یہ روایات کتب صحاح سے تخریج کی ہیں۔ لیکن انہوں نے اصل ماخذ کے نام بنام نہیں بتائے۔ حالانکہ کتب صحاح دحلان کی الدرالسنیہ سے زیادہ عام ہیں اور تقریباً تمام اہل علم بلکہ عوام کے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔ اس لئے دحلان کے واسطہ سے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا قادری صاحب کے پاس اصل کتب موجود نہیں ہیں؟ انہیں چاہیئے تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ خود ان کی تحقیق کرکے اصل ماخذ کا پتہ چلاتے اور بتاتے کہ پانچویں فلاں کتاب حدیث میں ہے اور چھٹی فلاں میں۔ دحلان کی کتاب نہ تو معروف کتب احادیث میں شمار ہوتی ہے اور نہ ہی وہ خود اتنے بلند پایہ ہیں کہ ان کا کہا سند مانا جائے۔ اگر قادری صاحب نے اصل کتب حدیث سے نقل کی ہوتیں تو وہاں ان کی اسناد بھی ملتیں جنہیں خود ان کے علاوہ ہم بھی دیکھتے اور پتہ چلتا کہ میزان جرح و تعدیل میں ان کی حیثیت کیا ہے۔ شاید قادری صاحب کو خود بھی اصل حیثیت کا علم ہے۔ جبھی تو انہوں نے اصل ماخذ بتانے کی بجائے ایک دوسری کتاب کا نام لے دیا ہے کہ قاری کا ذہن اسناد کی طرف منتقل نہ ہو سکے۔ ہم قادری صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مولانا محمد بشیر سہسوانی کی کتاب "صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الدحلان" کا مطالعہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ مفید نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

آٹھویں روایت ترمذی شریف سے منقول ہے۔ جس میں بیان ہوا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تا حیات تین قبیلوں یعنی ثقیف، بنی حنیفہ اور بنی امیہ کو ناپسند کرتے رہے" قادری صاحب نے محض نجد یمامہ کے قبیلے بنو حنیفہ کو رگیدنے کے لئے بلا تحقیق اسے درج کر دیا ہے۔ اس روایت میں جن تین قبائل کا ذکر ہے، ان میں ایک بنو امیہ ہے۔ یعنی رسول اکرمؐ اسے بھی تا حیات ناپسند کرتے رہے۔ جبکہ حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ جن میں سے ایک آپؐ نے ابوالعاص بن ربیع اموی کی زوجیت میں دی اور دو یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ بن عفان اموی کی زوجیت میں دیں اور صرف ایک ہاشمیوں میں بیاہی گئی۔ گویا آپؐ نے خود ہاشمی ہونے کے باوجود اپنی چار میں سے تین صاحبزادیاں اپنے مبغوض قبیلے بنی امیہ میں بیاہ دیں۔ پھر آپؐ کی ازواج مطہرات میں سے ایک حضرت ام حبیبہؓ ہیں جو امویوں کے رئیس حضرت ابوسفیانؓ کی بیٹی اور حضرت معاویہؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ جب امویوں سے ایسے قریبی تعلقات ہیں تو پھر ہم ارشد قادری صاحب کی پیش کردہ اس روایت کو کیونکر درست تسلیم کرلیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ روایت ان قبائل کے کسی دشمن نے وضع کرکے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی ہے۔ اور قادری صاحب جو دوسروں کو اجالا فراہم کر رہے ہیں خود اندھیرے میں رہنا چاہتے ہیں۔ ورنہ وہ جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں جبکہ اسلامی حکومت ابھی صرف دو صوبوں پر مشتمل تھی، یعنی مدینہ اور مکہ۔ اس وقت مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود تشریف فرما تھے اور مکہ میں اپنا قائم مقام یعنی گورنر مکہ آپؐ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ایسے اموی نوجوان عتابؓ بن اسید کو بنایا تھا جس کی ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ اور وہ آپؐ کے وصال مبارک کے بعد تک وہاں فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اگر آپؐ امویوں کو پسند نہ کرتے تھے تو اس اہم ترین تقرری کے کیا معنی؟ اسی سے اندازہ فرمالیجئے کہ قادری صاحب کی پیش کردہ اس روایت کی درایتًا کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟

نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں احادیث مشکوٰۃ سے نقل کی گئی ہیں۔ لیکن ان میں وہابیوں یا تبلیغیوں کا اشارہ تک نہیں بلکہ یہ تو خوارج کے متعلق ہیں۔ جیسا کہ مشکوٰۃ کے صفحہ ۳۰۸، ۳۰۹ پر موجود روایت کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"عن شریک بن شہاب قال کنت اتمنی ان القی رجلا من اصحاب النبی اسألہ عن خوارج فلقیت ابا برزۃ فی یوم عید فی نفر من اصحابہ فقلت لہ ھل سمعت رسول اللّٰہ یذکر الخوارج قال نعم سمعت باذنی ورأیتہ بعینی اُتی رسول اللّٰہ بمال فقسمہ فاعطی من عن یمینہ ومن عن شمالہ ولم یعط من وراءہ فقام رجل من ورائہ فقال یا محمد ما عدلت۔" الخ

اور اس سے آگے کا مضمون قادری صاحب کی روایات کے مطابق ہے عجیب بات ہے خوارج کی ہو رہی ہے اور صحابی انہی کے بارے میں استفسار کا جواب دے رہا ہے تو قادری صاحب کو کیا حق ہے کہ صحابی کو روند کر، ان روایات کو خوارج سے ہٹا کر وہابیوں پر چسپاں کر دیں؟

قادری صاحب کی پیش کردہ تیرھویں حدیث بخاری سے منقول ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "آخر زمانے میں نو عمر اور کم سمجھ لوگوں کی ایک جماعت نکلے گی، باتیں وہ بظاہر اچھی کریں گے لیکن ایمان ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔"

اس حدیث میں اس جماعت کے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں متعین کی گئی۔ نہ سمت مشرق کا تعین ہے، نہ نجد کا۔ اس لئے اسے وہابیوں پر چسپاں کرنا قادری صاحب کی دھاندلی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

چودھویں حدیث حلیہ سے نقل کی گئی ہے کہ:

"اخیر زمانے میں کیڑے مکوڑوں کی طرح ملانے پھوٹ پڑیں گے۔ پس تم میں سے جو شخص یہ زمانہ پائے، اسے چاہیئے کہ وہ ان سے خدا کی پناہ مانگے۔"

اس میں بھی نہ وہابیوں کا ذکر ہے نہ نجد کا، نہ سمت مشرق کا۔ اس لئے اسے بھی خلافِ دیانت وہابیوں کے سر منڈھ دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر ایک حدیث مشکوٰۃ سے منقول ہے کہ :

"ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدوں میں دنیا کی باتیں کریں گے۔ جب ایسا زمانہ آجائے تو تم ان لوگوں میں مت بیٹھنا"

آپ ہی بتائیں، اس میں وہابیوں کی طرف کون سا اشارہ ہے۔ ویسے مساجد میں دنیاوی باتیں کرنے میں بریلوی حضرات بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

پندرھویں حدیث کے متعلق ہم حیران ہیں کہ آخر اس کا موضوع سے کیا تعلق ہے ؛ دو صفحوں میں سمانے والی اس روایت میں ایک مدنی نوجوان کا ذکر ہے جس کے قتل کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ نہ تو یہ نوجوان نجدی تھا، نہ قبیلہ بنی حنیفہ سے متعلق تھا، نہ سمتِ مشرق سے اس کا تعلق تھا۔ وہابیوں سے متعلقہ اس باب میں اس کا ذکر ناقابلِ فہم ہے۔ ویسے بھی یہ روایت جس کتاب سے نقل کی گئی ہے، اس کا نام "البریز" بتایا گیا ہے۔ جس کی دریافت کا سہرا قادری صاحب کے سر پر ہی ہے، ورنہ کتبِ حدیث میں اس نام کی کوئی کتاب ہم نے تو دیکھی سنی نہیں!

بہر حال یہ وہ پندرہ روایات ہیں جن کی وجہ سے نجدِ یمامہ کے وہابی اور تبلیغی، قابلِ گردن زدنی قرار پاتے ہیں ——— خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ!

بندۂ خدا کوئی تو کام کی بات کی ہوتی ——— !

وہابیت اقبال کی نظر میں :

"تبلیغی جماعت نامی کتاب میں جناب علامہ ارشد القادری صاحب نجدِ یمامہ کو دار الفتن، محمد بن عبد الوہاب کو شیطان کا سینگ اور وہابیت کو تاریخ اسلام کا سب سے بڑا فتنہ قرار دے رہے ہیں۔ لیکن ایک دوسرا علامہ جس کی نظر عالمِ اسلام کے عروج و زوال اور افکارِ اسلامیہ کی نشو و نما پر یکساں ہے جو خود بھی عہدِ حاضر کا بہت بڑا مسلمان مفکر ہے اور دنیا بھر کے علماء جس کے علوم و نظریات سے کسبِ فیض کر رہے ہیں، اسی نجد کو اسلامی دنیا کا پاکیزہ حصہ، اسی محمد بن عبد الوہاب کو مصلحِ عظیم اور اسی تحریکِ وہابیت کو عہدِ حاضر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک قرار دے رہا ہے۔ تفصیل کے لئے ان کی "تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ" کا چھٹا خطبہ ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں اجتہاد کی نظری اہمیت بیان کرنے کے بعد عملاً اس کی بندش کے وجوہ و اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ نظری طور پر اہلِ سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کبھی انکار نہیں کیا۔ مگر جب سے مذاہب اربعہ قائم ہوئے ہیں، عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی۔ کیونکہ انہوں نے اس پر کچھ ایسی شرطیں لگا دی ہیں جن کا پورا کرنا ناممکن تو کیا، سرے سے محال ہے۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ روش اس نظامِ قانون نے اختیار کی جس کی بنیاد دین قرآنِ مجید پر استوار ہوئیں جو زندگی کو متحرک اور متغیر قرار دیتا ہے تو اور بھی تعجب ہوتا ہے۔" (صفحہ ۲۲۹)

اور پھر اس بندش کی وجوہات گنواتے ہوئے، آخری وجہ سقوطِ بغداد کو قرار دے کر، امام ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس پر قیامت یہ ہوئی کہ تیرھویں صدی کا وسطی زمانہ آیا تو اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز بغداد تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ یہ ایسی شدید ضرب تھی کہ اس عہد کے جن مؤرخوں نے تاتاری حملوں کی تاریخ لکھی ہے وہ بغداد کی تباہی کا حال بیان کرتے ہیں تو اس سے اسلام کے مستقبل کے بارے میں بڑی مایوسی پھیلی ہے۔ لہٰذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکر اپنی ساری کوششیں اس بات پر مرتکز کر دیتے کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملی" ایک رنگ اور یکساں صورت اختیار کرے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح ان میں مزید انتشار پیدا نہیں ہوگا۔ انہوں نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ فقہائے متقدمین نے قوانینِ شریعت کی تعبیر جس طرح کی تھی اس کو جوں کا توں برقرار اور ہر قسم کی بدعات سے پاک رکھا۔ وہ چاہتے تھے، جیسے بھی ممکن ہو اسلام کی ہیئت اجتماعیہ محفوظ رہے اور یہ بات وہ ہے جس میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی تھے۔ یہ اس لئے کہ قویٰ کے انحطاط کا سدباب نظم و ربط سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علماء نہیں سمجھتے تو یہ کہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، اور قدرت اور صلاحیت کیا؟ یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے اجتماعی افکار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اپنی حقیقی روح کھو بیٹھتا ہے۔ اندریں صورت اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں۔ زمانۂ حال کے ایک مصنف نے کیا خوب کہا ہے:

"تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو، ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی۔"

لہٰذا قویٰ کے انحطاط کے سدباب کا اگر کوئی ذریعہ فی الواقع مؤثر ہے تو یہ کہ معاشرہ میں اس قسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے افراد کی پرورش ہوتی رہے جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں۔ کیونکہ ایسے ہی افراد ہیں جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں جنکی بدولت یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول سرے سے ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں۔ اس میں اصلاح اور نظرِ ثانی کی گنجائش ہے۔ یوں بھی ماضی کا غلط احترام، علیٰ ہذا ضرورت سے زیادہ تنظیم کا وہ رجحان جس کا اظہار تیرھویں صدی اور بعد کے فقہاء کی کوششوں سے ہوتا ہے، اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا اور یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہؒ کی ذات میں جو بڑے سرگرم اہلِ قلم اور اسلام کے نہایت پرجوش مبلغ تھے اور جن کی ولادت ۱۲۶۳ھ میں یعنی زوالِ بغداد کے پانچ برس بعد ہوئی، اس روش کے خلاف ایک زبردست ردّ عمل رونما ہوا۔

امام موصوف کی تعلیم و تربیت حنبلی روایات کے مطابق ہوئی۔ وہ خود بھی اجتہاد کے دعویدار تھے اور اس مذاہب اربعہ کی قطعیت کا انکار انہیں پھر اصولِ اولین (قرآن و سنت) کی طرف لے گیا تاکہ اس سلسلہ میں کوئی نیا قدم اٹھا سکیں۔ مذہب ظاہری کے موسس ابن حزمؒ کی طرح انہیں بھی فقہ حنفی کے اصول قیاس اور اجماع سے، جیسا کہ فقہاء متقدمین ان کی تعبیر کرتے چلے آئے ہیں، انکار تھا۔ ان کی رائے تھی کہ اجماع ہی ہر قسم کے توہمات کا سرچشمہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد کے اخلاقی اور ذہنی تنزل، ضعف اور فرسودگی پر نظر رکھئے تو ان کا یہ خیال سرتاسر حق بجانب تھا۔ ایسے ہی سولھویں صدی میں سیوطیؒ نے بھی آزادیٔ اجتہاد کا دعویٰ کیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی کہ ہر صدی کے آغاز پر ایک مجدد کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن ابن تیمیہؒ کی تعلیمات میں جو روح کام کر رہی تھی اس کا ٹھیک ٹھیک اظہار اس تحریک میں ہوا جو بڑے بڑے امکانات کی حامل تھی اور جو نجد کے ریگزاروں سے جو بقول میکڈانلڈ "اسلام کی فرسودہ دنیا کا پاکیزہ ترین حصہ تصور کرنا چاہیئے" اٹھی اور جو فی الحقیقت عہدِ حاضر کے مسلمانوں میں زندگی کا اولین ارتعاش تھا۔ اس لئے کہ ایشیا ہو یا افریقہ، عالمِ اسلام میں اس کے بعد جو بھی تحریک پیدا ہوئی، بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی کے زیرِ اثر ہوئی۔ مثلاً سنوسی تحریک، تحریک اتحادِ اسلامی (سید جمال الدین افغانی کی تحریک) اور بابی تحریک جسے گویا عجمی صدائے بازگشت کہنا چاہیئے عربی احتجاجیت کی۔

بدعات کے مصلح عظیم محمدؒ بن عبدالوہاب کا سالِ ولادت ۱۷۰۰ء ہے۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں تعلیم پائی، ایران کا سفر کیا اور آخرالامر اس آگ کو جو ان کی بےچین روح میں دبی ہوئی تھی، سارے عالمِ اسلام میں پھیلا دیا۔ ان کی طبیعت اور خیالات کا رنگ بھی وہی تھا جو امام غزالیؒ کے شاگرد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمد ابن تومرت یعنی بدعات کے اس بربر مصلح کا جس کا ظہور اسلامی اندلس کے عہد زوال میں ہوا اور جن کی بدولت اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ بہر حال جہاں تک تحریک وہابیت کا تعلق ہے ہمیں اس سے بحث نہیں کہ محمد علی پاشا کے عساکر نے کب اور کس طرح اس کا خاتمہ کیا، یہاں بحث آزادئ اجتہاد کی اس روح سے ہے جو اس تحریک میں کام کر رہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ داخلی طور پر اس کا مزاج بھی سر تا سر قدامت پسند تھا۔ اس نے مذاہب اربعہ کی قطعیت سے تو انکار کیا اور اس لئے آزادئ اجتہاد کے حق پر بھی بڑے شد و مد سے زور دیا۔ لیکن ماضی کے بارے میں چونکہ اس کا نقطہ نظر سر تا سر غیر تنقیدی رہا۔ لہٰذا امور قانون میں اس نے اپنا دار و مدار صرف احادیث پر رکھا۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ خطبہ نمبر ۶، صفحہ ۲۳۲ تا ۲۳۵، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء)

یہ اقتباسات پیش کرنے کے بعد ہم پوچھتے ہیں کہ ہم کس علامہ کی بات مانیں، اقبال کی یا ارشد قادری کی؟ ہم عجیب مخمصے میں پڑ گئے ہیں، نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن۔ یقیناً ایک علامہ کا رخ سوئے کعبہ ہے اور دوسرے کا سوئے کلیسا۔ بہر حال آخری فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ کس کا رخ کس طرف ہے؟ ہم فیصلہ سنا کر آفت اپنے سر مول نہیں لینا چاہتے!

© rasailojaraid.com